



01-01-2017

# بہ صد سامان رسوائی سرِ بازاری رقص

مفتی منیب الرحمن

حضرت سید عثمان مروندی المعروف لعل شہباز قلندر رحمہ اللہ تعالیٰ کی ایک فارسی نظم قومی، مثنوی اور ملکی حالات کے تناظر میں ہمارے حسب حال ہے، اس نظم میں بار بار رقص کے ذکر کو اس کے شرعی جواز پر محمول نہ کیا جائے، یہاں رقص کا کلمہ خطّ اور لطف اٹھانے کے معنی میں ہے، لیکن ہماری لطف اندوزی کسی کار نمایاں پر نہیں، بلکہ اپنی رسوائیوں پر ہے، نظم درج ذیل ہے:

|   |  |
|---|--|
| نمی دانم کہ آخر چوں دم دیدار می رقصم    | مگر نازم بہ ایں ذوق کہ پیش یاری رقصم   |
| تو ہر دم می سرائی نغمہ و ہر باری رقصم   | بہ ہر طرز کہ می رقصانم اے یاری رقصم    |
| تو آں قاتل کہ از بہر تماشا خون من ریزی  | من آں بسل کہ زیر خنجر خوں خواری رقصم   |
| بیا جاناں تماشا کن کہ در انبوه جانبازاں | بہ صد سامان رسوائی سرِ بازاری رقصم     |
| اگرچہ قطرہ شبنم نہ پوید بر سر خارے      | منم آں قطرہ شبنم بہ نوک خار می رقصم    |
| خوش آں رندی کہ پامالش کنم صد پارسائی را | زہے تقویٰ کہ من با جبہ و دستار می رقصم |
| منم عثمان مروندی کہ یارے شیخ منصورم     | ملامت می کند خلق و من بر داری رقصم     |

ترجمہ: (۱) میں نہیں جانتا کہ محبوب کے دیدار کے وقت میں کیوں رقص کرنے لگتا ہوں، مگر اپنے اس ذوق پر مجھے ناز ہے کہ اپنے یار کے سامنے رقص کر رہا ہوں۔ (۲) (اے محبوب!) تو جب بھی نغمہ سرا ہوتا ہے، تو میں اس پر ہر بار رقص کرتا ہوں، تو مجھے جس انداز میں رقص کروانا چاہے، اے دوست! میں اُسی انداز میں رقص کرتا رہوں گا۔ (۳) (اے محبوب!) تو وہ قاتل ہے کہ تماشا لگانے کے لیے میرا خون بہاتا ہے اور میں وہ بسل ہوں کہ خونخوار خنجر کے نیچے بھی رقص کرتا ہوں (بسل، بسم اللہ الرحمن الرحیم کا مخفف ہے اور اس سے مراد ذبح کا وقت ہے کہ جب ذبیحہ کو لٹا کر ”بسم اللہ اکبر“ پڑھی جاتی ہے اور ذبح کے وقت ذبیحہ کے تڑپنے کی کیفیت کو بھی بسل سے تعبیر کرتے ہیں)۔ (۴) اے محبوب! آؤ اور تماشا کرو کہ میں جانبازاؤں کے ہجوم میں اپنی رسوائی کے سوسامان لیے سرِ بازار رقص کر رہا ہوں۔ (۵) اگرچہ شبنم کا قطرہ کانٹے کی نوک پر نہیں ٹھہر پاتا، لیکن میں وہ قطرہ شبنم ہوں کہ نوک خار پر بھی رقص کرتا ہوں۔ (۶) وہ رند بھی کیا خوب ہے کہ جس کی خاطر میں اپنی پارسائی کو پامال کر دیتا ہوں اور وہ تقویٰ بھی کیا خوب ہے کہ میں جبہ و دستار سمیت رقص کرتا ہوں۔ (۷) میں عثمان مروندی ہوں اور شیخ منصور حلاج کا دوست ہوں، مجھے ایک مخلوق ملامت کرتی ہے اور میں ہوں کہ سرِ دار بھی رقص کرتا ہوں۔“



اس نظم کا چوتھا شعر ہمارے کالم کا سرنامہ یا عنوان ہے۔ اقوام عالم میں ہم عجیب قوم ہیں، ہم ایسے معاملات کو، جنہیں بند کمرے میں یا براہ راست رابطے کے ذریعے طے کیا جاسکتا ہو، چوراہے کے بیچ طے کرنا پسند کرتے ہیں، ہم اپنی رسوائیوں پر ماتم کرنے کی بجائے ان کا جشن مناتے ہیں۔ آج اقوام عالم کے درمیان یہ ہماری انفرادیت اور پہچان بن چکی ہے۔ ڈان لیکس کے حوالے سے جو کچھ ہوا، وہ حسرت ناک ہونے کے ساتھ ساتھ حیرت ناک بھی ہے، یہ ہمارے حکمرانوں اور ہمارے فیصلہ ساز اداروں کی دانش و فراست کا منہ چڑانے کے لیے کافی ہے۔ معظم اور مہذب ملکوں میں بھی انتظامیہ اور اداروں کے درمیان اختلاف رائے ہوتا ہے، مگر اس کو حل کرنے کا ایک باوقار طریقہ کار بھی ہوتا ہے۔ ہمارے انتہائی ذمے دار ادارے، جنہیں ملکی اور قومی امور پر کافی حد تک کنٹرول حاصل ہے، ٹویٹ کو اپنی تشویش کا ذریعہ اظہار بناتے ہیں، کاش کہ ایسا نہ ہوتا۔ وزیر داخلہ چوہدری شاعری خان نے بجا کہا: ”ٹویٹس نظام اور انصاف کے لیے زہر قاتل ہیں“۔ حکمرانوں اور نظام کی غلطیاں اور کمزوریاں بجا، لیکن ان کی جانب متوجہ کرنے کا یہ طریقہ کسی بھی حال میں پسندیدہ نہیں ہے اور شاید پوری دنیا میں اس کی کوئی مثال نہ ملے۔ ہمارے دفاعی ادارے کو سب سے معظم اور با اختیار سمجھا جاتا ہے، سول حکومتیں بوجہ اُن سے دہلی دہلی سہمی سہمی سی رہتی ہیں اور اُس پر متزاد یہ کہ ہمہ وقت باہم محاذ آرائی پر آمادہ سیاست دان اپنی حرمت کو قدر مشترک بنانے اور سمجھنے کی بجائے ایک دوسرے کی رسوائیوں کا لطف اٹھاتے ہیں اور حضرت لعل شہباز قلندر رحمہ اللہ تعالیٰ کے الفاظ میں: ”بہ صد سامان رسوائی سر بازاری رقصم“ کا کامل مصداق بنتے ہیں۔

ہمارے سیاسی ڈھانچے اور سیاست دانوں کی یہی کمزوری اُن کی رسوائی کا سامان فراہم کرتی ہے، کل ایک فریق کے چہرے پر کا لگ ملکی جا رہی تھی، آج دوسرے فریق کا چہرہ ہے اور کل آئندہ کسی تیسرے فریق کا چہرہ مشق ستم بنے گا، لیکن اگر اس چہرے کا نام ہم ”حکمران اور سیاست دان“ رکھ لیں، تو یہ رسوائی پورے سیاسی نظام اور سیاسی اخلاقیات کے چہرے کی کا لک ہے۔ ہم اپنی کا لک کو گورا سمجھنے کی خوش فہمی میں مبتلا ہوں، تو پھر یہ مرض ناقابل علاج بن جاتا ہے۔ تاہم سیاسی حکمرانوں کی تمام تر کمزوریوں اور بے تدبیروں کے باوجود بعد ادب گزارش ہے کہ اس سے ہمارے حساس اور ذمے دار اداروں کا وقار بلند نہیں ہوا۔ دوسری جانب بد قسمتی سے ہمارے حصے میں جو آزادی میڈیا آیا ہے، اُس کی لغت میں بھی قومی وقار، ملک و قوم کی عزت و ناموس اور نظام کی حرمت کو کوئی معنی نہیں رکھتی، انہیں صرف بلند و بالا آہنگ میں رونق محفل سبجانی ہے اور بہ ہزار حیلہ و تدبیر ناظرین کو اپنی اسکرین کے ساتھ جوڑے رکھنا ہے، وطن و ملک کی ناموس چہ معنی دارو، اس ڈبئی نہاد پر بھی صرف افسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔

حضرت لعل شہباز قلندر کی نظم کے تیسرے شعر پر غور کریں تو ہمارے طاقتور ادارے ہمارے سول حکمرانی کے ہیولاتی ڈھانچے کو مرغ نسل کی طرح خنجر خونخوار کے نیچے رقص کرتا دیکھنے کا تماشا لگاتے ہیں اور اس سے لطف اٹھاتے ہیں اور دنیا کو بتاتے ہیں کہ ہمارے سول حکمرانوں کی اوقات کیا ہے؟ اُن کی نااہلیوں کے پیش نظر یہ تصویر یقیناً بعض حضرات کے نزدیک نہایت پسندیدہ ہے اور وہ اس سے حسب توفیق لطف بھی اٹھاتے ہیں اور گچے کے پہ گچے کا لگاتے ہیں، مگر ہمیں اس پر اس لیے افسوس ہوتا ہے کہ یہ چہرہ ہمارے ہی نظام ریاست و حکومت کا ہے، سو کیا اپنی تذلیل پر خوش ہونا اور لطف اٹھانا کسی باحیثیت اور غیور قوم کا شعار ہونا چاہیے، لیکن صد افسوس کہ ہمارے ہاں منظر یہی ہے۔ حکومت اور حکمرانی کا نشہ ایسا ہے کہ نوک خار پر سر بازار رقص گناں ہونے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔



ایسے حالات میں ہمارے دوست اور دشمن ممالک بھی یقیناً تذبذب میں مبتلا ہوتے ہوں گے کہ پاکستان کے جمہوری سیٹ آپ میں پاکستان کا حقیقی چہرہ کون سا ہے، اس ملک کا حقیقی دماغ کہاں ہے اور پاکستان کی زبان یعنی ترجمان کون ہے، وہ کس سے بات کریں اور کس سے معاملات طے کریں، سب جانتے ہیں کہ ہماری پارلیمنٹ اور حکومت کی حیثیت کیا ہے؟ کسی نے سچ کہا ہے:

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

ترجمہ: ”پورے کا پورا بدن زخموں سے چور چور ہے، پھیلا رکھوں، تو کہاں کہاں رکھوں۔“ ایک وقت تھا کہ عدالت ہائے عظمیٰ و عالیہ کے فاضل جج صاحبان اپنے فیصلوں کو آئین و قانون اور سابق عدالتی نظائر سے موثق اور مدلل کرتے تھے، آج پاپولزم یعنی عوامی مقبولیت کا دور ہے۔ اس لیے فاضل جج صاحبان اپنے فیصلوں میں خلیل جبران کے فرمودات اور ماریو پوزو کے ناول ”گاڈ فادر“ سے اقتباسات نقل کرتے ہیں تاکہ فیصلے کو مقبولیت عائد ملے اور وہ زبان زد خاص و عام ہو جائے۔ یہ شعاع عزت مآب جناب جسٹس دوست محمد کھوسہ نے رائج کیا۔ انہوں نے پہلے این آر او کے فیصلے میں خلیل جبران کا حوالہ دے کر میڈیا کے لیے زبان کے چٹخارے کا اہتمام کیا اور اب پاناما لیکس کے فیصلے میں ”گاڈ فادر“ نامی ناول کے ابتدائی اقتباسات کو اختلافی نوٹ کے ذریعے نمایاں کر کے مقبولیت کا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ سواب ہمارے فیصلے آئینی و قانونی حوالہ جات اور عدالتی نظائر سے مدلل نہیں ہوں گے، بلکہ ناولوں، افسانوں اور ادیبوں کے حوالوں سے مسجع و مرصع ہوا کریں گے اور ہم ان قابل قدر مآخذ سے عدل کشید کریں گے، کیسا مقام افتخار ہے۔ ہمارے آزاد میڈیا کو بھی یہ ادبی سوغات اور نرم و ملائم و لذیذ روحانی غذا مبارک ہو۔ پہلے ہم ”دیوان حافظ“ سے فال نکالنے کا سنا کرتے تھے، اب ہماری عدالتوں کے فیصلے بھی اسی طرح کے دیوانوں، افسانوں اور ناولوں سے برآمد ہوں گے۔

اختلافات کی حقیقت اور جواز مسلم، صورت و جسامت، قد و قامت اور رنگتوں کے متئوع کے ساتھ ساتھ افتاد طبع، ذہنی نہاد اور ترجیحات میں تفاوت بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کے متئوع مظاہر میں سے ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”اور اُس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش ہے اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے، بے شک اس میں جہان والوں کے لیے ضرور نشانیاں ہیں، (الروم: 22)۔“ سو ہر چیز میں متئوع نہ صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مظہر ہے، بلکہ اُس کی حکمت بھی اس کے پیچھے کا فرما ہوتی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”اور اگر اللہ چاہتا تو (اپنے نیکوینی امر سے) تم سب کو ایک امت بنا دیتا، لیکن وہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے، (النحل: 93)۔“ مگر اُس کی مشیت نے یہ چاہا: ”تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے، وہ دلیل سے ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے، وہ دلیل سے زندہ رہے، (الانفال: 42)۔“ یعنی اللہ تعالیٰ کا قانون مکافات عمل کے تقاضے پورے ہونے کے بعد رو بہ عمل آتا ہے۔ پس فرد کے ساتھ اختلاف اور اُس کی ناپسندیدگی کے باوجود قومی مناصب کا کسی نہ کسی درجے میں احترام ضروری ہے، یہ اقوام عالم کے درمیان ایک مسلمہ اور مشترکہ قدر ہے، سو ہمیں بھی اپنے نظم اجتماعی کے لیے کوئی نہ کوئی اقدار وضع کر کے اُن کی پاسداری کا اہتمام بھی کرنا چاہیے۔